علامہ اقبال ــ ایک مرد خدا مست*

مولانا محمد حسین عرشی

علامہ اقبال کی شاعری کا آغاز بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہوا ۔ میں نے پہلے پہل ان کا نام ایک طرحی گلدستہ میں دیکھا ۔ اس وقت وہ صرف شیخ محمد اقبال تھے۔ مدیر رسالہ نے ان کی غزل کی خاص طور پر تعریف کی تھی اور انہیں ایک ہونہار نوجوان شاعر قرار دیا تھا ۔

یہی زمانہ انجمن حمایت الاسلام اور رسالہ مخزن کی تاسیس سے تعلق رکھتا ہے ۔ ان دو ذریعوں سے شیخ محمد اقبال کی شہرت لاہور سے نکل کر پورے ملک میں پھیل گئی ۔ خصوصاً ان کی نظم ''شکوہ'' نے دنیائے شعر و ادب میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا ۔ مخالف و موافق دونوں قسم کی آوازیں اٹھنا شروع ہو گئیں ۔

یہی وہ زمانہ تھا جب ہندوستانیوں میں غلامی کا احساس ابھرا ــــ میں نے مولانا ظفر علی خان کے مشہور عالم اخبار ''زمیندار'' کا وہ دور بھی دیکھا جب اس کے پہلے صفحے پر نمایاں طور سے یہ شعر لکھا ہوا تھا ۔

تم خیر خواہ دولت برطانیہ رہو
سمجھیں جناب قیصر ہند اپنا جاں نثار

پھر وہ وقت بھی آیا کہ اس قسم کے خیال رکھنے والوں کو مولانا نے ''ٹوڈی'' کا ذلیل خطاب بلکہ گالی عطا فرمائی اور اس شعر کی بجائے یہ نیا شعر تاج سر ''زمیندار'' بنا ۔

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

یہی زمانہ مولانا ابوالکلام کے ''الہلال'' و ''البلاغ'' اور مولانا محمد علی جوہر کے ''ہمدرد'' اور ''کامریڈ'' کے عروج کا تھا ۔

ہندوؤں کو صرف انگریز کی غلامی سے نجات کی فکر تھی ۔ مسلمانوں کو اس کے ساتھ ساتھ اسلامی ممالک کی زبوں حالی کا غم بھی کھائے جاتا تھا ۔ علامہ اقبال ملت بیضا کی زبان بن کر ایک طرف وطنیت کے نغمے الاپ رہے تھے تو دوسری طرف ملت اسلامیہ کے عالمگیر ادبار پر بھی آنسو بہا رہے تھے ۔ ترکی علاقے بلقان ، طرابلس، ایڈریا نوپل ، سمرنا وغیرہ ایک ایک کر کے مغربی حکومتوں کے قبضے میں آتے جا رہے تھے ۔ جب بھی کوئی ہولناک خبر آتی ، ہندوستانی

---

* یہ مقالہ اقبال اکادمی کی خصوصی نشست میں بتاریخ ۱۰ اگست ۱۹۷۳ء پڑھا گیا ۔

مسلمانوں کے قلوب غم و اضطراب کا گہوارہ بن جاتے ، جلسے ہوتے ، ترکوں کی مدد کے لئے چندہ جمع کیا جاتا ، مسلمان عورتیں اپنے زیورات تک اتار کر دے دیتیں ، وفود مرتب ہو کر کبھی ترکی اور کبھی برطانیہ جاتے ۔ مجھے یاد ہے سقوط سمرنا کے موقع پر امرتسر میں ایک کہرام برپا تھا ۔ ایک نوجوان گلیوں اور بازاروں میں بہت بلند اور سوزناک آواز سے ایک پنجابی نظم پڑھتا تھا تو لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ جمع ہو جاتے ، آہیں بھرتے اور آنسو بہاتے تھے ۔ اس نظم کا ایک شعر مجھے ابھی تک یاد ہے اور وہ آواز گویا کانوں میں گونج رہی ہے ۔

روندے سمرنا دے بال وے ، بیوہ ہو گیاں مائیاں
مصطفیٰ پاشا کمال وے ، تیریاں دور بلائیاں[1]

دنیائے اسلام کی نظریں اس وقت مصطفیٰ کمال پر جمی ہوئی تھیں ۔ ان کا اپنا بیان ہے :

''خراب و خستہ ملت کو دشمن کے رحم پر چھوڑ کر وہ لوگ جنہوں نے اسے جنگ کی آگ میں جھونک دیا تھا ملک سے فرار ہو چکے تھے ۔ فوجیوں کے پاس ہتیار اور گولہ بارود ختم ہو چکا تھا ، اتحادی سلطنتیں ترکی کے حصے بخرے کرنے کے لئے کوشاں تھیں اور دارالسلطنت میں ان کی فوجوں کا ہجوم تھا ۔ اُطنہ کی ولایت پر فرانسیسی قابض تھے ۔ مرعش ، عین تاب اور عرفہ پر انگریز ۔ انطاکیہ اور قونیہ میں اطالوی فوجیں موجود تھیں ، مرزیفون اور سمسون میں بھی انگریز سپاہی نظر آتے تھے ، ہر سمت اجنبی ضابطہ مامور اور جاسوس کارفرما تھے''۔ حکومت سلطنت اور خلافت سب الفاظ بے معنی ہو چکے تھے ۔ ترکی شاعر نامق کمال نے کہا تھا : ''وطن کے گلے پر دشمن نے اپنا خنجر رکھ دیا ہے ۔ اس سیہ بخت ماں (یعنی مادر وطن) کو نجات دلانے والا کوئی بھی نہیں''

مصطفیٰ کمال جو نجات دلانے کے لیے آگے بڑھ رہے تھے استنبول کی حکومت نے ان کے خلاف علماء سے فتوے لے کر شائع کئے بلکہ ان کے قتل کا حکم جاری کر دیا ۔ ان پر بغاوت کا الزام لگایا گیا ، ان کی گرفتاری کے خفیہ احکام بھیجے گئے ۔

انہی دنوں ہمارے شہر امرتسر کی بڑی عیدگاہ میں مولانا ابوالکلام نے جو اس وقت تک مسلمانان ہند کے متفقہ عظیم رہنما سمجھے جاتے تھے ایک آتشیں تقریر کی جس کی تاثیر سے پورا مجمع آہوں اور آنسوؤں کا ہنگامہ زار بن گیا ۔ خلاصہ' تقریر کچھ اس طرح تھا :

---

١ ۔ ترجمہ : سمرنا کے بچے رو رہے ہیں ۔ مائیں بیوہ ہوگئیں ۔ اے مصطفیٰ کمال پاشا تیری بلائیں دور ہوں ۔

''آج اس دنیا میں پرندوں کے لئے گھونسلے ہیں، چرندوں کے لئے چراگاہیں ہیں، بھیڑیوں اور بچھوؤں کے لئے بھی رہنے کے ٹھکانے ہیں ۔ سانپوں اور چوہوں وغیرہ حشرات الارض کے لئے زمین میں بل ہیں لیکن مسلمانوں کے لئے کوئی جگہ نہیں، کوئی ٹھکانہ نہیں ، کوئی پناہ نہیں ''

اسی زمانہ میں مولانا شبلی نعمانی کی واقعاتی نظمیں ''زمیندار'' کے صفحہ اول پر شائع ہوتی تھیں ۔ ان کی ایک طویل نظم ''شہر آشوب اسلام'' اور ''ہنگامۂ طرابلس و بلقان'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی جس کے دو آخری شعر یہ ہیں ۔

حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغان حرم کے آشیاں کب تک ؟
جو ہجرت کرکے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں ؟
کہ اب امن و امان شام و نجد و قیروان کب تک ؟

لسان العصر اکبر الہ آبادی کے دل کی گہرائیوں سے یہ چیخ نکلی:

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر
مجھے تو ان کی بہبودی سے ہے یاس

سب سے پہلے امت مرحومہ کے سب سے بڑے مرثیہ گو مولانا حالی نے فریاد کی ۔

اے خاصۂ خاصان رُسُل وقت دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
فریاد ہے اے کشتئی امّت کے نگہباں
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے

علامہ کی نظمیں ہر وقت نکلتیں اور مسلمانوں کے گہرے جذبات کی ترجمانی کرتی تھیں ۔ وہ جلسوں میں نظم پڑھتے ، اُن کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوتے ، ساتھ ہی سارا مجمع اشک بار ہو جاتا ۔

سقوط طرابلس کے وقت ان کی نظم جو ''بانگ درا'' میں ''حضور رسالتمآب میں'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے ایسے ہی جذبات کی عکاسی کرتی ہے جس میں وہ تحفے کے طور پر ایک آبگینہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کرکے عرض کرتے ہیں :

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

اور نظم "فاطمہ بنت عبداللہ" بھی جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی تھی اسی دور کی یادگار ہے۔

فاطمہ تو آبروئے ملت مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے

لیکن حیرت انگیز بات یہ کہ حضرت علامہ اس عالم گیر حرمان و یاس کی حالت میں بھی مایوس نہیں تھے جیسا کہ اسی نظم سے ظاہر ہوتا ہے۔

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

فاطمہ کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربت خاموش میں
پل رہی ہے ایک قوم تازہ اس آغوش میں
بے خبر ہوں گرچہ ان کی وسعت مقصد سے میں
آفرینش دیکھتا ہوں ان کی اس مرقد سے میں

ایک اور نظم بعنوان "مسلم" میں لکھتے ہیں۔

آشکارا ہیں مری آنکھوں پہ اسرار حیات
کہہ نہیں سکتے مجھے نومید پیکار حیات
کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے
یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار
فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوش کارزار

یہ شعر جون ۱۹۱۲ء میں لکھے گئے جب کہ ہر طرف یاس کے بادل منڈلا رہے تھے۔ اس کے گیارہ برس بعد ۱۹۲۳ء میں اقبال کی "فتح کامل" کا ظہور مصطفیٰ کمال اتاترک کے تدبر و شجاعت سے چشم عالم نے دیکھا — علامہ نے زندگی بھر کسی وحی و الہام وغیرہ کا دعویٰ نہیں کیا۔ اس کے باوجود ان کی زبان سے نکلی ہوئی بہت سی باتیں حرف بحرف پوری ہوئیں۔ میں اس کی تفصیل اپنے ایک مضمون "اقبال کی پیش گوئیاں" میں عرض کر چکا ہوں۔ ایک سوچنے والے دل میں بار بار یہ سوال اٹھتا ہے کہ ایک شاعر کو پیش بینی کی قوت کہاں سے حاصل ہوئی؟ اس کا جواب بھی وہ بہت پہلے یعنی ۱۹۰۵ء سے قبل کی ایک نظم "تصویر درد" میں دے چکے ہیں۔

عطا ایسا بیاں مجھ کو ہوا رنگیں بیانوں میں
کہ بام عرش کے طائر ہیں میرے ہم زبانوں میں
اثر یہ بھی ہے اک میرے جنون فتنہ ساماں کا
مرا آئینۂ دل ہے قضا کے رازدانوں میں

علامہ ھی کی شاعری پر یہ پرانا مصرع صادق آتا ھے ۔

"شاعری جزویست از پیغمبری"

اور یہ شعر بھی:

مشو منکر کہ در اشعار ابی قوم
ورائے شاعری چیزے دگر ھست

یہی بات مولانا گرامی استاد نظام دکن نے کھل کر کہہ دی تھی:

در دیدۂ معنی نگہاں حضرت اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفت

آج ھمارے جسم کا آدھے سے زیادہ حصہ کٹ گیا ۔ ھماری چودہ سو سالہ تاریخ میں ایسی ناکامی کی کوئی نظیر نہیں اور دشمن کی ھزارھا سالہ "مہابھارت" اور "رامائن" میں ایسی کوئی کام یابی نظر نہیں آتی ۔ لیکن اس کے باوجود ھمارے دیدۂ بے نم سے ایک قطرہ اشک نہیں ٹپکا ، بالائی طبقے کی عیش کوشیوں میں کوئی فرق نہیں آیا ۔ علامہ کے الفاظ میں ۔

"کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رھا"

اس تمہید کے بعد میں اپنے موضوع کی طرف آتا ھوں ۔

اس یاس و قنوط کے عالم میں لوگ علامہ کی نظم کے منتظر رھا کرتے تھے ۔ جب کوئی نئی نظم بذریعۂ "زمیندار" یا بذریعہ جلسۂ "حمایت الاسلام" عوام تک پہونچتی تو ان کی ڈھارس بندھ جاتی اور ایک حد تک تسکین و امید کی کیفیت پیدا ھو جاتی ۔ اسی دوران میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ علامہ بالکل خاموش ھوگئے ۔ ایک عرصہ تک ان کی طرف سے حالات حاضرہ پر کوئی منظوم تبصرہ سماعت نواز نہ ھوا ۔ لوگ حیران تھے کہ ترجمان حقیقت علامہ اقبال کا قلب حسّاس آج کل کس مقام و منزل میں ھے ؟

یہ نہ بھولئے کہ میں آج سے نصف صدی سے بھی چند سال قبل کی صحبتوں میں آپ کو لئے جا رھا ھوں جب کہ مسلمانوں کے تمام مذھبی اور سیاسی رھنما اسلامی اخلاص کی چنگاریاں سینے میں لئے ھوئے زبان اور قلم کی پوری قوت سے سرگرم عمل تھے ۔ سُنا جاتا ھے کہ علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے غیر معمولی سکوت کو برداشت نہ کرتے ھوئے بعض لوگوں نے مختلف ذرائع سے اپنے جذبات ان تک پہونچائے ۔ لیکن اُدھر سے "صدائے برنخاست" کی کیفیت میں کوئی تبدیلی نہ ھوئی ۔ آخر میرے ایک محترم اور فاضل دوست ماسٹر شیخ عبیداللہ امرتسری مرحوم نے جو حضرت علامہ کے عشق و عقیدت میں سرشار تھے ۔ مجھ سے کہا کہ ایک نظم ایسی لکھو جو حضرت علامہ کی خدمت میں عقیدت مندوں کے جذبات کی

ترجمانی کر سکے ۔ میں نے اپنی ہیچ میرزی کے اعتراف کے ساتھ معذرت کر دی ۔ لیکن وہ مُصر رہے ۔ میں نے بار بار کہا ایسی عظیم ہستی کے سامنے مجھ ایسے نا اہل کی بات کی کیا وقعت ہو سکتی ہے ؟ اُدھر سے اصرار بڑھتا گیا ، میں نے ہتیار ڈال دئے ۔ اتنی پُرانی بات اب اچھی طرح تو یاد نہیں ۔ کچھ ایسا خیال پڑتا ہے کہ وہ کاغذ قلم لے کر بیٹھ گئے اور میں شعر لکھواتا گیا ۔ ان کا ذوق شعری بہت بلند تھا ۔ اتفاق سے ان کو یہ اشعار پسند آ گئے اور انہوں نے مولانا ظفر علی خان کی خدمت میں برائے اشاعت ارسال کر دیے ۔ یہ اشعار اُس وقت کی آواز تھے۔ دوسرے تیسرے ہی دن ''زمیندار'' کے صفحہ اول پر جلی قلم سے شائع ہو گئے ۔

اتنی بات یہاں اور کہتا چلوں کہ نظم کا عنوان میں نے غالباً '' ڈاکٹر اقبال سے خطاب '' لکھا تھا ۔ مولانا نے بدل کر '' خطاب بہ علامہ اقبال'' کر دیا ۔ شاید یہ ان کی انگریز اور انگریزیت سے نفرت کا اثر تھا کہ انہوں نے ڈاکٹر کے لفظ پر عربی لفظ علامہ کو ترجیح دی ۔ اس کے علاوہ نظم میں بھی ایک جگہ تبدیلی کی ۔

میرا مصرع تھا :

'' بادہ کیف آموز از جذبات ذوق افزائے تو''

مولانا ظفر علی خان نے '' جذبات '' نکال کر اُس کی جگہ لفظ ''تخئیل'' رکھ دیا ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عربی میں جذبات کی ذال متحرک ہے اور میں نے اُسے ساکن باندھا تھا جو اساتذہ نے جائز رکھا ہے ۔ لیکن مولانا کی عربیت نے اتنا بھی گوارا نہ کیا ۔

اس کے بعد فوراً ہی دوسرے یا تیسرے دن علامہ کی طرف سے جواب شائع ہو گیا ۔ میری نظم کے بعض مقصدی اشعار پیش خدمت ہیں ۔ تمہید و خطاب کے بعد عرض کیا تھا :

اے توئی در آشیان و گلشنت برباد رفت
نغمۂ ماندی و پرواز تو با صیاد رفت
خیز و گلبانگ دہل در گنبد خضرا فگن
از قبور آئند خلقے شور صور آسا فگن
خیز ازیں کنج متانت جلوۂ بر ما فگن!
ہاں بیا ہمچوں سنائی گوئے در میداں بزن!

جواب میں حضرت علامہ نے جو تابندہ و رخشندہ اشعار کہے وہ بھی سن لیجئے ۔

دانی کہ چیست شیوۂ مستان پختہ کار ؟
عرشی گماں مدار کہ پیمانہ ام شکست

دارم هنوز از کرم ساقئی حجاز
آهے درونه تاب که خیزد ز سینه مست
از شاخسار فطرت من می دمد هنوز
آن لالهٔ که موج نسیمے دلش نخست
لیکن شنیدهٔ که دم گردش شراب
پیر عجم چه گفت برندان مے پرست ؟
دانا که دید شعبدهٔ چرخ حقّه باز
هنگامه باز چید و در گفتگو به بست

مولانا ظفر علی خان نے جو نظم و نثر کے بحر ذخار تھے اور بدیہہ گوئی میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے ۔ علامہ کے قطعہ کے نیچے اپنی طرف سے اسی زمین میں اتنے ہی اشعار اردو میں رقم فرمائے جن میں میری عرض نیاز کی تائید کرتے ہوئے علامہ سے مخاطب ہوئے ۔

بندہ نواز هم سے نہیں کچھ چھپی ہوئی
پیر فلک کی شعبدہ بازی کی بود و هست
مانا کہ آسمان سے شمس و قمر کی فوج
پیہم اتر رہی ہے کہ ظلمت کو دے شکست
مانا کہ ان کو جو نظر آتے ہیں سر بلند
چرخ ستیزہ کار کرے گا زبون و پست
لیکن نہ قول سعدی شیراز بھولئے
چھوٹا کہیں جو ہاتھ سے سر رشتهٔ الست
رفتن به پائے مردیٔ همسایه در بهشت
حقّا کہ با عقوبت دوزخ برابر استٔ

میرے استاد مولانا حکیم فیروز الدین احمد طغرائی رحمہ" اللہ علیہ آن دنوں جموں کے کسی سکول میں معلم تھے ۔ ان کی نظر سے میری گزارش تو نہیں گزری ۔ علامہ رحمہ" اللہ علیہ کے اشعار انھوں نے دیکھ لئے ۔ بہت متاثر ہوئے ۔ اپنا یہ تاثر انھوں نے اسی زمین میں چند اشعار کی شکل میں منتقل کر دیا ۔ اور ایک پوسٹ کارڈ پر لکھ کر مجھے بھیج دیا ۔ میں نے وہ پوسٹ کارڈ لفافے میں بند کر کے مولانا ظفر علی خان کی خدمت میں ارسال کر دیا ۔ حکیم صاحب نے بھی میری تائید میں یہی چاہا کہ اس وقت علامہ کو اپنے حیات افروز کلام سے افراد ملت کی رہنمائی کرنی چاہیے ۔ کچھ نمونہ ان کا بھی دیکھ لیجئے ۔ راقم الحروف کو مخاطب فرماتے ہیں :

امروز در فضائے زمیندار دیدہ ام
ز اقبال پاسخے کہ دل آرزو بخست

نادیدہ خاطرم بخطاب تو وا رسید
نشنیدہ مدعائے تو در ذہن من نشست

خواہم کہ نکتۂ بسرائم دریں خصوص
ہر چند غم نوائے نشاط مرا شکست

عالم بصد ہزار زباں کنج خامشیست
شاعر دراں میانہ لب نطق پرورست

باشد برائے دیدۂ بینا مقام حیف
گر کور و چاہ دید و وصدائش ندادہ است

گیرم کہ گنج فلسفہ و حکمت است کس
اما چہ سود مہر سکوت ار لبش بہ بست

ان اشعار میں حضرت علامہ کے فلسفہ و حکمت کا صحیح اعتراف کرتے ہوئے موثر پیرائے میں ان سے مہر سکوت توڑنے کی خواہش کا اظہار کیا گیا ہے۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس زمانۂ سکوت میں علامہ اپنی بعض کتابوں کی تالیف و تصنیف میں منہمک رہے جو بعد میں تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد قوم کے ہاتھوں میں پہونچتی رہیں۔

یہی زمانہ تھا جب صوفی تبسم سے میرا تعارف ہوا۔ صوفی صاحب ان دنوں خالصہ کالج امرتسر میں پڑھتے تھے اور شعر کا شوق بھی کرتے تھے۔ یہی شوق باعث ہوا میرے ان کے درمیان دوستی کا۔ انہوں نے مجھ سے اس معاملہ میں مشورہ چاہا۔ میں انہیں اپنے استاد حکیم طغرائی مرحوم کی خدمت میں لے گیا۔ انہوں نے کچھ عرصہ حکیم صاحب سے استفادہ کیا۔ پھر ایم اے کلاس کا داخلہ لاہور کے (غالباً) اسلامیہ کالج میں لے لیا جہاں ان دنوں حضرت محمود شیرانی (والد اختر شیرانی) اور مولانا محمد شفیع ایسے اساتذہ سے مستفیض ہونے کا موقع ملا۔

لاہور کے زمانۂ قیام میں وہ حضرت علامہ سے بھی ملتے رہتے تھے اور جب ان کی کوئی تصنیف شائع ہوتی تو دلی اشتیاق سے خرید لاتے، پڑھتے اور امرتسر آتے تو غیر معمولی علمی و ادبی تحفے کے طور پر مجھے دکھاتے۔ میرا معمول یہ تھا کہ جب بھی علامہ کی کوئی نئی چیز سامنے آتی میں اپنے تمام مشاغل چھوڑ کر بالکل تنہائی میں اس میں محو ہو جاتا۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ ایک ہی دن میں پوری کتاب پڑھ ڈالی۔

بال جبریل اور جاوید نامہ کا مجھ پر غیر معمولی اثر ہوا۔ تنہا بیٹھا پڑھ رہا ہوں اور آنکھوں سے سیلاب اشک رواں ہے۔ جاوید نامہ نے تو مجھ پر ایسا جادو کیا کہ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ حضرت علامہ "زندہ رود" کے نام سے روح رومی علیہ الرحمتہ کی رہنمائی میں ہفت افلاک اور ماورائے افلاک کی سیر کر رہے ہیں، ساکنان عالم

بالا کی ارواح سے مکالمے ہو رہے ہیں، نکتہ آفرینیاں اور حکمت آموزیاں ہو رہی ہیں، اور میں بھی ان دونوں بزرگوں کے پیچھے پیچھے وہ سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہوں جو وہاں پیش آرہا ہے۔ یوں سمجھئے کہ گویا میں اس عالم مادی سے کٹ گیا ہوں۔ یہ کمال شعر، یہ تاثیر، یہ عمق اور یہ ساحری، سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے مثنوی روسی اور مثنوی جاوید نامہ کے سوا کسی بھی شاعر کے کلام میں نظر نہیں آئی۔

جاوید نامہ میں ایک مقام ایسا آیا جہاں میں آگے بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ تاہم اس رکاوٹ کو دل میں رکھ کر سیر افلاک و ماورائے افلاک پوری طرح ختم کی۔ جب صوفی تبسم صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں نے اس خاص مقام کی طرف انہیں متوجہ کر کے اظہار خیال کیا۔ اگلے دن انہوں نے لاہور پہونچ کر علامہ سے اس کی وضاحت چاہی۔ پھر جب امرتسر آئے تو حضرت علامہ کی تشریح سے مجھے مستفیض کیا۔ میں نے اس پر اپنی رائے ظاہر کی۔ صوفی صاحب نے لاہور جا کر علامہ سے اس کا ذکر کیا۔ انہوں نے پھر جو کچھ ارشاد فرمایا، مجھ تک پہنچایا گیا۔ اب یہ یاد نہیں کہ کتنی مرتبہ یہ غائبانہ مکالمہ ہوتا رہا۔ آخر ایک دن صوفی صاحب آئے، مجھ سے کہا: لاہور آئیے اور حضرت علامہ سے روبرو بات ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے اس کا موقع فراہم کیا۔ میں لاہور پہونچا اور ہم حضرت علامہ کی خدمت میں حاضری کے لیے تیار ہوئے۔ مجھے یہ بات یہاں واضح کر دینی چاہیے کہ میں اس بارگاہ علم و فضل میں حاضر ہونے اور دو بدو گفتگو کرنے کے قابل اپنے آپ کو نہیں سمجھتا تھا۔ میں بڑی ہچکچاہٹ سے اس شرط پر تیار ہوا کہ میرا نام ظاہر نہ کیا جائے۔ اگر علامہ پوچھیں تو صوفی صاحب اتنا ہی کہہ دیں کہ یہ شخص امرتسر میں ان کا ہمسایہ ہے، ملنے کا شوق لے کر حاضر ہوا ہے۔ صوفی صاحب نے میری یہ شرط تسلیم کر لی۔ چند امرتسری دوست اور بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ یہ واقعہ علامہ کی میکلوڈ روڈ والی کوٹھی سے متعلق ہے۔

صوفی صاحب نے میری شرط کی پروا نہ کرتے ہوئے جاتے ہی کسی اور کا تو نہیں میرا نام ظاہر کر دیا۔ میں سخت شرمسار ہوا۔ بات چیت کا آغاز ہوا۔ علامہ کے انداز گفتگو میں سادگی، بے تکلفی اور اپنائیت سی تھی جس سے میری مرعوبیت دور ہو گئی اور میں ہر نکتے پر اظہار خیال کرتا رہا۔ وہ میری معروضات پر توجہ فرماتے اور مجھے مطمئن کرنے کی کوشش فرماتے رہے۔

یہ مکالمہ میں نے انہیں دنوں اپنے ماہ نامے ''بلاغ'' میں شائع کر دیا تھا۔ یہاں اس تفصیل و تطویل کو نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہوں۔

اس ملاقات کے بعد میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں ملاقات کا کوئی موقع نہیں ملا ۔

امرتسر میں میرا اسلوب زندگی ایسا رہا کہ ہر سال موسم گرما میں کسی پہاڑی مقام کشمیر وغیرہ اور سرما ضلع ساہیوال (جو ان دنوں منٹگمری کہلاتا تھا) کے ایک کشت زار میں دو چار ہفتے گزارتا اور مطالعہ کے لیے کچھ کتابیں ساتھ رکھتا ۔ ایک مرتبہ میں نے مثنوی رومی اور تفسیرالمنار (دروس مفتی محمد عبدہ مصری) کا انتخاب کیا ۔ میرا یہ سفر ایک بہشتی تخلیہ تھا ۔ دوران مطالعہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ پیر روم کی مجلس میں بیٹھا ان کے کلمات حکمت و عرفان سن رہا ہوں ۔ مولانا اپنی محفل میں بہت کم تنہا ہوتے تھے ۔ کبھی ان کے پاس عطار و سنائی اور کبھی بایزید بسطامی و ذوالنون مصری اسرار عشق و عرفان بیان کرتے نظر آتے تھے ۔ کبھی اور بے شمار انبیاءؑ و اولیاءؒ اور حکماءؒ و عقلاء متکلم معلوم ہوتے تھے ۔ تقریباً اٹھارہ دن میں میں نے نصف سے زیادہ متن مثنوی کا مطالعہ کر لیا ۔ ایک شعر سے بھی سرسری عبور نہیں کیا ۔ ہر شعر پر غور کرتا ، ہر ترکیب سے لذت یاب ہوتا لیکن اس دوران میں بہت سے مقام ایسے آئے ، جہاں میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا اور ایک رفیق راہ کی طلب میں بے چین ہو جاتا ۔ بعض اوقات پیر روم خود فرما دیتے :

یار باید راہ را تنہا مرو ! از سر خود اندریں صحرا مرو !
کے تراشد تیغ دستہ خویش را رو بجراحے سپار ایں ریش را

ایسی حالت میں میں نے اپنے گرد و پیش نگاہ ڈالی تو مجھے حضرت علامہ کے سوا کوئی ایسا شخص نظر نہ آیا جو حل مشکلات میں میری مدد کر سکے ۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ بال جبریل اور جاوید نامے کے مطالعے سے مجھ پر یہ حقیقت واشگاف ہو چکی تھی کہ مثنوی کے واعظ اور مدعی تو بہت ہیں لیکن رومی کے بحر بے پایاں میں غوطے لگا کر در ہائے ناسفتہ نکالنے والا علامہ کے سوا کوئی نہیں ۔ بال جبریل میں انھوں نے اپنے آپ کو مرید ہندی اور مولانا کو پیر رومی کہہ کر کئی اہم نکتوں کا انکشاف فرمایا ہے اور جاوید نامہ تو سارے کا سارا ہی ایک ایسا روحانی سفر ہے جس میں حضرت علامہ پیر رومی کے کے ساتھ ساتھ اور کبھی پیچھے پیچھے چلتے دکھائی دیتے ہیں ۔

میں گاؤں سے امرتسر واپس پہنچا تو آتے ہی میں نے پہلا کام یہ کیا کہ علامہ کی خدمت میں ایک عریضہ لکھا جس میں اپنے شوق و طلب اور خواہش استفادہ کا اظہار کیا ۔

علامہ جواب خط میں کبھی تساہل نہیں کرتے تھے اور سائل کی

پوری تسلی کرنے میں بھی بے پروائی نہیں کرتے تھے۔ اس کا جواب بہت جلد مجھے موصول ہو گیا ۔ اس تبرک کو ملاحظہ فرمائیے :

لاہور ۱۹ مارچ ۱۹۳۵ء

جناب عرشی صاحب السلام علیکم

آپ کا خط ابھی ملا ہے ۔ میری صحت عامہ تو بہت بہتر ہو گئی ہے مگر آواز پر ابھی خاطر خواہ اثر نہیں ہوا ۔ علاج برقی ایک سال تک جاری رہے گا ۔ دو ماہ کے وقفہ کے بعد بھوپال جانا ہوگا ۔

آپ اسلام اور اس کے حقائق کے لذت آشنا ہیں ۔ مثنوی رومی کے پڑھنے سے اگر قلب میں گرمئی شوق پیدا ہو جائے تو اور کیا چاہئے ، شوق خود مرشد ہے ۔ میں ایک مدت سے مطالعۂ کتب ترک کر چکا ہوں ۔ اگر کبھی کچھ پڑھتا ہوں تو صرف قرآن یا مثنوی رومی ۔ افسوس ہے ہم اچھے زمانے میں پیدا نہ ہوئے ۔

کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں ایک بھی صاحب سرور نہیں

بہر حال قرآن اور مثنوی کا مطالعہ جاری رکھئے ۔ مجھ سے بھی کبھی کبھی ملتے رہئے ۔ اس واسطے نہیں کہ میں آپ کو کچھ سکھا سکتا ہوں بلکہ اس واسطے کہ ایک ہی قسم کا شوق رکھنے والوں کی صحبت بعض دفعہ ایسے نتائج پیدا کر جاتی ہے جو کسی کے خیال میں بھی نہیں ہوتے ۔

یہ بات زندگی کے پوشیدہ اسرار میں سے ہے جس کو جاننے والے مسلمانان ہند کی بد نصیبی سے اب اس ملک میں پیدا نہیں ہوتے ۔ زیادہ کیا عرض کروں ۔

محمد اقبال

اس کے بعد میں برابر حاضر خدمت ہوتا رہا اور استفادہ کرتا رہا ۔ میرے اکتساب و استفادہ کا طریقہ شروع ہی سے کچھ اس قسم کا رہا ہے کہ ابتدائی چند کتابیں تو باقاعدہ سبقاً سبقاً پڑھتا ۔ پھر خود ہی گھر پر مطالعہ کر لیتا اور صرف مشکل مقامات اساتذہ سے دریافت کر لیتا ۔ اس طرح تھوڑے وقت میں زیادہ اکتساب ہو جاتا ہے اور استاد کو بھی زیادہ مغز پاشی کی زحمت نہیں ہوتی۔ یہی معاملہ میرا حضرت علامہ کے ساتھ رہا ۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے اپنے سوالات کی ایک مختصر فہرست بنا لیتا اور حاضر ہو کر یکے بعد دیگرے عرض کرتا اور ان کے ارشادات سے پوری طرح مطمئن ہو کر آگے بڑھتا جاتا ۔ آپ جاوید منزل میں منتقل ہو چکے تھے ، یہ علاقہ ان دنوں میو روڈ

کہلاتا تھا اور اب اقبال روڈ ہے ۔ میں اسٹیشن سے اتر کر اپنے دوسرے کاموں کو موخر کر کے پہلے حضرت علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتا ۔ کبھی پہونچتے ہی حاضری کا شرف حاصل ہو جاتا ۔ اگر کبھی آپ پہلے سے آئے ہوئے کسی ملاقاتی یا ملاقاتیوں سے مصروف گفتگو ہوتے تو علی بخش کی چارپائی پر بیٹھ کر انتظار کرتا ۔ عموماً میں تنہا حاضر ہوتا ۔ کبھی کبھی میرے ساتھ آپ کا کوئی شائق و عقیدت مند میرا دوست بھی شامل ہو جاتا ۔

میرے سوالات عموماً عمق قرآنی ، علمی ، ادبی ، تاریخی ، اخلاقی ، حکیمانہ اور صوفیانہ نکات پر مشتمل ہوتے تھے ۔ علامہ ہر سوال کے جواب میں عموماً ایسے ایسے دلائل و شواھد ارشاد فرماتے کہ میرا دامن سوال کوتاہ اور اور ان کی بخشش جواب اتنی وافر ہوتی کہ

داماں نگہ تنگ و گل حسن تو بسیار
گلچین جمال تو ز داماں گلہ دارد

والا معاملہ ہو جاتا ۔ ایک طرف تو وہ مطالعہ و معلومات کا خزانہ تھے، دوسری طرف طویل مرض اور پیرانہ سالی کے باوجود حافظہ اتنا قوی و محفوظ تھا کہ حیرت ہوتی تھی ۔ ہر سوال کا فوری اور شافی جواب مثالیں دے دے کر پوری تفصیل سے سمجھاتے تھے۔ میں نے کبھی ان کو اکتائے اور تھکے ہوئے نہیں دیکھا ۔ ہمیشہ میری ہی طرف سے سلسلۂ کلام بند ہوتا اور میں رخصت طلب کرتا تھا ۔ امرتسر پہنچ کر اس صحبت کا خاص قسم کا اثر کئی کئی دن تک مجھ پر قائم رہتا ۔ امرتسری احباب مجھ سے ملاقات کا حال دریافت کرنے کے لیے منتظر رہتے تھے اور مجھ سے علامہ کی باتیں سن کر متاثر ہوتے تھے ۔ اگر میں ان گفتگوؤں کو انہیں دنوں سپرد قلم کر لیا کرتا تو عجیب و غریب معلومات کی ایک کتاب بن جاتی ۔ آج مجھے اپنے اس تساہل پر افسوس ہو رہا ہے ۔ ان کی رحلت کے بعد محمود نظامی مرحوم نے ان کے ملنے والوں کو آمادہ کیا کہ اپنی اپنی ملاقاتوں کے حالات قلم بند کر کے انہیں دے دیئے جائیں ۔ چنانچہ انہوں نے ''ملفوظات'' کے نام سے ایک مجموعہ شائع کیا ۔ مجھے جو کچھ مختصر سا یاد رہ گیا وہ بھی اس مجموعے میں شامل ہے ۔ اس کو پڑھنے والے اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان گفتگوؤں میں کیسے کیسے مشکل مسائل اور عمیق نکات ان کی زبان مبارک سے واضح ہو کر سائل کو مطمئن کر دیتے تھے ۔

یہ تحریر یہاں تک پہونچی تو مجھے اپنی ایک پرانی یادداشت مل گئی جو ماہ اگست ۱۹۳۸ء کو علامہ کی رحلت سے تقریباً تین ماہ بعد سپرد قلم کی گئی تھی ۔ اس کے بعض اقتباسات پیش خدمت ہیں ۔

مجھے علامہ کی خدمت میں حاضر ہونے میں کچھ دیر ہو جاتی تو صوفی صاحب کے توسط سے خود یاد فرما لیتے ۔ مجھے جب کبھی لاہور جانے کا اتفاق ہوتا تو بالعموم ہر کام سے پہلے جاوید منزل کا رخ کرتا ، گھنٹوں باتیں ہوتیں، مختلف مسائل پر جامع اور سیر کن گفتگو ہوتی ، میں تنہائی میں ملاقات سے لطف اندوز ہونے کے خیال سے عموماً اتوار کی حاضری سے مجتنب رہتا کیوں کہ اتوار کو ملاقاتیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا ۔ دوسرے دنوں میں خوب موقع مل جاتا تھا ۔ میں نے آپ کو دور اور نزدیک دونوں طرح سے دیکھا ۔ بے حد مخلص اور درد مند پایا ۔ صبح سے شام تک آپ کی زبان سے جو تقریر ترشح ہوتی تھی اگر وہ قلم بند ہو سکتی تو ہر روز ایک نہایت بلند پایہ ، نہایت دلچسپ اور معلومات پر مبنی کتاب بن جایا کرتی ۔ میں جب ملاقات کر کے آتا تو کئی دنوں تک اسی نشہ میں سرشار رہتا ۔ احباب سے یہی باتیں رہتیں ۔ آخری چند سالہ مرض کے ایام میں آپ کی روح ، مادی اثرات سے بہت کچھ آزاد ہو چکی تھی ۔ آپ کی صحبت میں ایک طالب حقیقت کو وہی حظ حاصل ہوتا تھا جس کی طرف عارف رومی نے توجہ دلائی ۔

یک زمانے صحبتے با اولیا بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

میں نے حضرت علامہ کے وجود میں کیا پایا ؟ ایک با خبر رفیق راہ جو کٹھن منزلوں میں پوری رفاقت کرے ، ایک شفیق بزرگ جو کامل دل سوزی سے حل اشکال کر دے ایک مرشد طریق جو نشیب و فراز جادہ و منزل سے آگاہ ہو ، ایک واقعی ہم خیال جو اس دنیا میں ناپید ہے ۔ ایک محبوب دوست جس کی محبت روز بروز پھلتی پھولتی محسوس ہو ۔ ایک خدا رسیدہ عارف جس کی صحبت میں دنیوی مصائب کا گلا گھٹ جائے ، ایک جامع شرق و غرب فاضل جس کی زنبیل علم و فضل میں ہر سوال کا جواب مہیا ہو ۔ آہ وہ مقام جہاں یہ دولت میسر ہوتی تھی!

ایا منازل سلمیٰ فامن سلماك

اے سلمیٰ کے ٹھہرنے کی جگہو ! تمہاری سلمیٰ کہاں رو پوش ہو گئی؟

آج جو لوگ ان کے ماتم میں پیش پیش ہیں افسوس ہے کہ ان میں سے اکثر ان کی تعلیم کے عملی پہلو کے منکر ہیں۔ قدر دانی یہ نہیں کہ ہم ان کے ماتم میں عظیم الشان جلسے کیا کریں اور طویل مرثیے لکھیں ۔ اگر ہم ان کی روح کو تسکین دینا چاہتے ہیں تو ہمیں ان کی تعلیم کی عملی تبلیغ کرنی چاہئے ۔ ان کا ذوق خود داری ، خلوص ، سوز و گداز ، وسعت مشرب اور بلندیٔ عزائم ہمارا مطمح نظر ہونا چاہیے۔ انھوں نے ایک ہی گیت ہر لے میں گایا ، ایک ہی رمز ہزار طرح سمجھائی ، ایک ہی بات بار بار کہی ، صرف اس لیے کہ ہم سمجھیں ، سمجھ کر متاثر ہوں اور حیوانیت و غلامی کے زندان سے نکل کر انسانیت و آزادی کی روح پرور فضا میں سانس لینے کے قابل ہو جائیں ۔ میں اس گزارش کو علامہ

مرحوم کے ایک مناسب محل شعر پر ختم کرتا ہوں جو عہد جہانگیری میں کہا جاتا تو شاعر پر گوہر و الماس نچھاور کر کے بھی قدر دانی کا حق ادا نہ ہو سکتا ۔ فرماتے ہیں :

بحرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوق حضوری طول دادم داستانے را

علامہ کی رحلت پر میرا یہ تاثر ماہ نامہ 'بلاغ' ماہ مئی ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا ۔

فقیدالشرق

علامہ سر اقبال رحمتہ‌اللہ علیہ

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح تمام عالم انسانیت کے لیے وہ زہرہ گداز پیام لے کر طلوع ہوئی جس کو تاریخ علم و دیانت میں بیسویں صدی عیسوی کا سب سے بڑا حادثہ تسلیم کیا جائے گا ، عارف رومی سے سات سو سال بعد رفقائے اسلام و انسانیت کو بیدار کرنے کے لیے ایک ''مرد خدا مست'' مبعوث ہوتا ہے جس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے بادل امنڈ رہے ہیں ۔ گلے میں فریادیں ابل رہی ہیں ، سینے میں آہوں کے آتشکدے فروزاں ہیں ، وہ اپنی چنگاری سے جہان بارد کی پہنائیوں کو گرما دینا چاہتا ہے ـــــ اقبال ، آہ وہ اقبال جو اس دنیائے دام و دو میں انسانیت کبریٰ کا نمونہ تھا ۔ جو اپنے منتظر فوق‌البشر (SUPERMAN) کی خود مثال تھا، جس کی صحبت

یک زمانے صحبتے با اولیا
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

کا صحیح مصداق تھی۔ جس‌کی خلوت و جلوت' اللہ' محمد، قرآن' حجاز اور بیت‌العتیق کے روح افروز تذکروں سے معمور تھی، جس نے ہمارے ''روہتر کستان، قافلے کو اپنی بانگ درا کے جوش' جبریلی بال کی جنبش اور کلیمی ضرب کی صولت سے منزل کعبہ کی طرف رہنمائی کی ـــ آج عظمت انسانی کا یہ مقدس دانہ بڑھنے اور پھلنے پھولنے کے لیے خلوت خاک میں گوشہ نشیں ہوتا ہے ۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم اس کی چہل سالہ فریادوں کا مطلب سمجھیں اور اس کی حقیقی زندگی سے جو اب شروع ہے' بہرہ اندوز ہوں ۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما